لسانیات

زبان کے بنیادی مسائل کا تحقیقی جائزہ



نعمان نیئر کلاچوی

لسانیات

زبان کے بنیادی مسائل کا تحقیقی جائزہ

نعمان نیئر کلاچوی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام مقالہ	لسانیات
مصنف	نعمان نیئر کلاچوی
ناشر	مرشد پبلی کیشنز، کلاچی،ڈیرہ اسماعیل خان
پی ڈی ایف ایڈیشن	مارچ،2026

فہرست

پیش گفتار

بہت پہلے مَیں نے روزنامہ پاکستان کیلئے ایک مضمون لکھا تھا اسباقِ لسانیات اور تب ارادہ تھا کہ اِسی کو مزید وسعت دے کر ایک مکمل اور محقّق مضمون تیار کر لیا جائے لیکن پھر حیات ناثبات نے وہ غُرندیاں دِیں کہ اِس طرف پھر دھیان ہی نہ جا سکا۔ اب جبکہ قرآن کی لغت پر کام کر رہا ہوں تو ایک بار پھر سے یہ مسائل لاینحل سامنے آ کھڑے ہوئے کہ آخر زبان اپنی اصل میں کیا ہے اور اِس سے ایک متن کیسے پیدا ہوتا ہے اور پھر اُس متن سے مصنف کا کیا تعلق رہتا ہے اور اِسی طرح یہ متن اپنے مخاطبین سے کیسے رابطہ قائم رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

چلیں اب اِس موضوع پر قلم اُٹھا ہی لیا ہے تو آرزو یہی ہے کہ یہ انتہائی دقیق اور پیچیدہ مضمون خیر سے اپنے تمام ذیلی موضوعات کے ساتھ تمام بخیر ہو جائے تو لسانیات کے طلبہ کا بھلا ہو جائے۔

لسانیات جسے زبان کا علم بھی کہا جاتا ہے ایسا دقیق علم ہے کہ اِس کی مبادیات اور ارتقاء کو سمجھتے سمجھتے صدیاں گزر گئیں لیکن فی الحال ہم اِس نتیجے پر نہ پہنچ سکے کہ زبان انسانی معاشرت میں فہم و ابلاغ کا باقاعدہ ذریعہ کب اور کیسے بنی لیکن خیر کچھ بنیادی اُصول اِس وقت بھی ایسے ہیں کہ جنہیں دھوم دھڑلے سے کہا جا سکتا ہے کہ

یہی اٹل ہیں اور ابھی تک اِنہی کی اطاعت کی جارہی ہے۔ مَیں کوشش کروں گا کہ غیر ضروری اور بے فائدہ مفروضات سے گریز کروں اور بحث اِس قدر بھی دقیق نہ ہو کہ ایک عام طالبعلم کو خود یہ مضمون سمجھنے کیلئے لغت و تاریخِ لسانیات کا رُخ کرنا پڑے۔ میرا استدلال مجرّب ہو گا اور ہر سوچنے سمجھنے والا انسان اِسے بغیر کسی پیشگی مفروضے کے سمجھ لے گا۔ زبان ہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعے سے ہم انسان ایک دوسرے سے شعوری، جذباتی اور اخلاقی طور پر مربوط رہتے ہیں ورنہ تو شاید زبان کے بغیر کسی مہذب انسانی معاشرت کا تصور ہی ممکن نہ ہوتا۔ زبان کی اہمیت متنوع ہے۔ یہ ہمیں مذاہب، روایات، مابعدالطبیعیات، اخلاقیات، جذبات، تاریخ واَدب اور سائنس وفنون سے جوڑے رکھتی ہے۔ یہ اگر محض تبادلہِ خیالات و جذبات کا وسیلہ ہوتی تو اِس کی اِس قدر اہمیت نہ ہوتی لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ پوری انسانی تہذیب اگر کسی ایک ستون پر کھڑی ہے تو وہ زبان ہے۔ اندازہ لگالیں کہ زبان کس قدر اہم شے ہے۔اِن چند جملوں کے بعد مَیں اپنے اصل موضوعات کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔

فقیر

نعمان نیئرؔ کلاچوی 16 مارچ،2026

زبان کی مبادیات

زبان کیا ہے؟۔زبان ایک معاشرتی ذریعہ ہے تبادلہِ خیالات و جذبات کا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے بنتی ہے۔ زبان کیسے بنتی ہے اِس معمہ کو ایک دلچسپ مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

ایک شخص رات کو سویا ہوا تھا اور صبح ایک عجیب قسم کے شور سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اُٹھا اور باہر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ اچانک اُس کی نظر گھر میں موجود درخت کی ٹہنیوں پر پڑی جہاں سے وہ شور کی آواز آ رہی تھی۔ یہ شور دراصل ایک پرندے کا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اِسی پرندے کے شور نے مجھے جگا دیا ہے۔ اُس نے جھٹ سے ہاتھ میں کوئلہ پکڑا اور پتھر پر اُس پرندے کا نقش (Image) بنا دیا۔ یہ پہلا مرحلہ ہے زبان کو وجود میں لانے کا۔

پرندے کا نقش بنا کر وہ اِسے ذہن میں بٹھا چکا۔ پرندہ اُڑ گیا۔ کچھ وقت گزرا اُس شخص کے گھر میں ایک اور شخص آیا اور اُس نے دیکھا کہ یہ شخص آج بے چینی محسوس کر رہا ہے۔ وقت سے پہلے جاگا ہوا یہ شخص بے تاب تھا کہ وہ اپنے مہمان کو بتائے کہ وہ کیوں آج بے چین ہے لیکن مسئلہ وہی کہ بتائے تو آخر کیسے بتائے۔ دونوں ایک دوسرے کا مشاہدہ تو کر رہے ہیں لیکن ابلاغ نہیں ہو پا رہا۔ وقت سے

پہلے جاگے ہوئے شخص نے گھر آئے مہمان کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اُس پتھر کی طرف لے گیا جہاں اُس نے اُس شور کرنے والے پرندے کا نقش بنایا تھا وہ دِکھا دیا تو مہمان کو قدرے تسلی ہوگئی کہ میرے اِس دوست کی بے چینی کی وجہ یہ نقش ہے۔ زبان کے وجود کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔

ایک شخص جو دو باتیں جانتا تھا یعنی پرندہ کا مشاہدہ اور اُس کا نقش اِس نے اپنے مہمان دوست کو پرندے کا نقش دِکھا کر اپنے مشاہدے میں شامل کر لیا۔ اِس کے بعد ایک تیسرا شخص گھر میں داخل ہوتا ہے اور اپنے اِن دو دوستوں کو پریشان دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے تو اُس کی پریشانی دور کرنے کیلئے وہ جاگا ہوا شخص اچانک منہ سے نکالتا ہے چِر چِر یعنی پرندے کی وہ مخصوص آواز جسے انگریزی میں Phone کہتے ہیں۔ یہ زبان کے وجود کا تیسرا مرحلہ ہے۔

تیسرے شخص کو باقی کہانی کی سمجھ تو نہیں آئی لیکن وہ بس یہی سن لیتا ہے کہ چِر چِر۔ یہی چِر چِر جب اِس شخص کی وساطت سے مزید کچھ لوگوں تک پہنچتا ہے تو چِر بن جاتا ہے اور پھر اِسی سے بگڑ کر چِریا اور آخر میں چِڑیا بن جاتا ہے۔ فلہٰذا زبان کی پہلی اینٹ مشاہدہ ہے۔ دوسری اینٹ نقش اور تیسری اینٹ آواز ہے۔ اب آپ دنیا کی کسی بھی زبان کے اسماء و افعال کی کھوج لگائیں تو وہ اپنی اصل میں مشاہدات ہیں یا

نقش یا آوازیں۔ مثلاً اُردو زبان کا لفظ گائے اصل میں ایک جانور کا مشاہدہ ہے۔ یہ مشاہدہ جب آواز بنا تو گاں گاں بن گیا کیونکہ یہ اُس جانور کی مخصوص آواز تھی، یہی گاں گاں آخر میں ایک مکمل بامعنیٰ لفظ گائے بن گیا۔

انسانی ہاتھ کو پنجہ کہتے ہیں۔ یہی پنجہ اپنی اصل میں ایک مشاہدہ ہے پھر یہ آواز بنا تو کہیں پنجہ کہیں بنجہ کہیں مچہ کہیں ماچا تو کہیں تماچا بن گیا۔ آخری لفظ تماچا یعنی انسانی ہاتھ جب کسی موقع پر اپنے دوسرے ہاتھ پر لگا تو یہ پنجہ مارنا بن گیا۔ پھر ایک موقع آیا کہ کچھ لوگ گھوم گھوم کر اپنے دونوں پنجے ایک دوسرے پر مارتے چلے جا رہے ہیں۔ لوگوں نے دیکھا اور کہا کہ یہ تو لوگ تماچے مار رہے ہیں یعنی دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا بجا کر گھوم رہے ہیں۔

جنھوں نے مشاہدہ کیا تھا جب وہ گھروں میں گئے تو اپنے گھر والوں کو بتایا کہ آج تو فلاں مقام پر لوگ تماچے مار رہے تھے۔ جنھوں نے مشاہدہ نہیں تھا کیا اُنہوں نے یہ لفظ پکڑ لیا۔ پس اب جہاں کہیں بھی لوگ تماچے مار کر گھومتے اُسے تماچا کہا جانے لگا۔ یہی تماچا بعد میں تماشا بن کر ہر طرح کے جمگھٹ اور مخصوص جسمانی حرکات کی نمائش کیلیئے بولا جانے لگا۔ انسانی معاشرت میں زبان اِسی طرح سفر کرتی ہے اور یہ سفر دنیا کی ہر زبان میں ایسے ہی ہوتا ہے۔

مشاہدات سے نقش بنتا ہے۔ نقش سے آواز اور پھر آواز سے لفظ پھر لفظ سے اصطلاح اور اصطلاح سے روزمرہ پس روزمرہ سے محاورہ اور محاورہ سے تشبیہ اور پھر تشبیہ سے استعارہ بن کر ایک مکمل زبان وجود میں آجاتی ہے۔

زبان کے متعلق کچھ بنیادی اُصول ہمیشہ کیلئے گانٹھ باندھ لینے کے لائق ہیں۔ زبان کوئی بھی ہو اِس کی کُل عمر کم و بیش چالیس سال ہے۔ اِس عرصہ کے بعد کوئی بھی زبان اپنے نئے مخاطبین کیلئے اجنبی بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں زبان اتنی زیادہ لچکدار اور چیونگمی ہے کہ اِسے ہر بیس کلومیٹر کے بعد چبالیا جاتا ہے۔ یعنی ہر چالیس کلومیٹر دائرہ نما جغرافیہ میں ایک زبان کی دو اقسام پائی جاتی ہیں۔ پوری دنیا میں زبانوں کا یہی حال ہے۔

مَیں رابطے کی زبان (Communication Language) کی بات نہیں کر رہا یہ تو ممکن ہے کہ کہیں دس ریاستوں میں ایک ہی ہو، دراصل مَیں بات کر رہا ہو اُس زبان کی جو لوگوں کی مادری زبان ہے یا جو خطّوں کی زبان ہے۔ پس کسی بھی اصلی زبان کی کُل مدّت اتنی ہے کہ پوتا دادی کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہماری دادی ہماری امّاں سے کہا کرتیں کہ "نینگراَج ویلے تے ٹُکّر چھکِ گِن" یعنی لڑکی آج وقت پر روٹی بنالو۔ ہمیں تب سمجھ نہیں آتا کہ یہ ٹُکّر کیا ہے جبکہ آج ہم

سرائیکی میں یہ لفظ نہیں استعمال کرتے بلکہ ہمارے بعد والی نسل تو سرے سے اِس لفظ ہی ناواقف ہے۔ دادی اور پوتے کا تو خیر ایک اچھا خاصا فاصلہ ہے بعض اوقات تو ہم اپنی امّاں کے وہ الفاظ جو ہمیں نہیں سکھائے گئے سمجھنے میں مشکل پیش آجاتی کہ یہ کیا لفظ امّاں بول گئی ہے۔

برصغیر میں اُنیسویں صدی کی ابتداء میں دہلی میں روزمرہ "یادرکھیں" کی جگہ بولا جاتا تھا "سنا چاہئے"۔ اب سنا چاہئے اور یادرکھیں کے بیچ میں بھی کئی تغیرات آئے اور وہ سبھی اُتنے ہی اہم ہیں جتنے سنا چاہئے اور یادرکھیں لیکن جب کوئی زبان رابطے یا مذہب کی زبان بن جاتی ہے تو غیر اہلِ زبان زبردستی کوشش کرتے ہیں کہ زبان کی ایک خاص قسم کو زبردستی یعنی مصنوعی طریقے سے روکے رکھیں تاکہ ابلاغ میں مشکل پیدا نہ ہو۔ اِس مصنوعی طریقے کو ہم قواعدِ زبان یعنی Grammar کہتے ہیں ورنہ جس طرح کی اُردو علامہ محمد اقبال اور فیض احمد فیض اپنی شاعری میں لکھ گئے ہیں پورے برصغیر میں ایسی اُردو کہیں بھی نہیں بولی گئی حتیٰ کہ یہ اَدیب جب خود بھی آپس میں گفتگو کرتے تو ایسی اُردو بولنے سے یکسر گریز کرتے اور اُسی اصلی زبان کو اختیار کرتے جو ایک عام آدمی بول رہا تھا۔ ع

جو تیری یادوں سے مُشک بُو ہیں

جو تیرے عشّاق کا لہو ہیں

اُبل پڑے ہیں عذاب سارے

ملالِ احوالِ دوستاں بھی

خمارِ آغوشِ مَہ وَشاں بھی

غبارِ خاطر کے باب سارے

فیض احمد فیض

پتہ نہیں یہ اُردو بر صغیر میں کہاں اور کون لوگ بولتے رہے۔

افسوس ناک بات ہے لیکن یہی سچ ہے کہ ہر زبان اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود کم و بیش چالیس سال کے بعد فوت ہو جاتی ہے اور پھر اِس کی جانشین زبان اِس سے ہر لحاظ سے یعنی اسلوب میں، اصطلاح میں، روز مرہ اور محاورہ میں یکسر مختلف ہوتی ہے۔ کوئی بھی زبان دراصل اہلِ زبان کی ذاتی میراث ہوتی ہے اور اہلِ زبان ہی اپنی زبان میں جملہ تصرفات کا حق رکھتے ہیں۔ یوں ہر چالیس سال کے بعد جہاں زبان پوری طرح بدل جاتی ہے تو وہاں اہلِ زبان بھی بدل جاتے ہیں چنانچہ ہم ٹُکّر والی نسل نہیں ہیں ہم تو کھانا والی نسل ہیں۔ اب ہمارے اور دادی کے بیچ بھی ایک

نسل ہے یعنی ہماری امّاں لوگ جن سے ہم نے اپنی زبان سیکھی وہ روٹی والی نسل ہے اور اب روٹی اور کھانے کے بعد ہم سے بھی آگے ایک نسل ہے جو ڈنر اور لنچ والی نسل ہے۔ زبان اپنی ذات میں کوئی عام حادثاتی مظہر نہیں ہے بلکہ اِسی ایک شے پر ہمارا مذہب، کلچر، اخلاقیات، تاریخ و اَدب، جمالیات، سائنس اور فنون کھڑے ہیں۔ یہ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ مَیں اِن میں ایک ایک موضوع پر پورا ایک ایک مقالہ لکھ سکتا ہوں کہ کس طرح زبان کے بغیر مذاہب و اخلاقیات تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔ زبان کی اِس ضروری بحث کے بعد مَیں اب ترتیب وار لفظ، اصطلاح، روزمرہ، محاورہ، تشبیہ اور استعارہ کی مبادیات بیان کرتا ہوں۔

لفظ کیسے بنتا ہے؟

لفظ اپنی ذات میں مشاہدہ، نقش یا آواز ہے۔ مثلاً پراکرت زبان کا ایک عام لفظ ہے "پیار"۔ یہ لفظ دراصل اَپ بھرنش یعنی بگڑی ہوئی سنسکرت کا ہے جسے ہم پراکرت بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ لفظ اپنی اصل ساخت میں دو الگ الگ الفاظ کا مرکب ہے یعنی پی اور آر۔ پی پراکرت میں پتی یعنی شوہر کو کہتے ہیں اور آر بیوہار یعنی رویے کو کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اِس سے بھی پیچھے جاسکتے ہیں؟، بالکل جاسکتے ہیں۔ پی اصل میں ایک مشاہدہ ہے اور اِس کی اصل شکل پِیا ہے۔ پیا قدیم سنسکرت میں

کسی بھی انسان کا سیدھا لیٹ جانے کو کہتے ہیں۔ یہی لفظ بالکل اِسی شکل اور معانی میں آج بھی ہماری سرائیکی زبان میں استعمال ہوتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ "پیا ہِیں جُواناں؟ "یعنی لیٹے ہوئے ہو اے جوان؟۔ اِسی طرح آر قدیم سنسکرت میں کہتے ہیں اُٹھنے بیٹھنے کو۔ چنانچہ اپنی اصل میں یہ دونوں الفاظ مشاہدات ہیں۔ جب ایک عورت کا کسی مرد کے ساتھ مستقل لیٹنا جائز ہو گیا تو وہ مرد اُس کا پتی یعنی شوہر بن گیا۔ اِسی کو آج بھی ہندی میں پی یا پِیا بھی کہتے ہیں۔ اب پیار کی طرف آ جائیں۔ پی یعنی لیٹنا اور آر یعنی روّیہ مطلب کسی کے ساتھ لیٹنے جیسا روّیہ اختیار کرنے کو کہتے ہیں پیار کرنا۔ لفظ کی اِس خاص بناوٹ کو عربی میں علم الصّرف اور انگریزی میں Morphology کہتے ہیں جبکہ ایک لفظ سے دوسرا لفظ بن جانے تک کے مکمل تاریخی سفر کو علم الاشتقاق یعنی Etymology کہتے ہیں۔ لفظ کی یہ بناوٹ تو خاصی دلچسپ ہے لیکن اِس میں ایک خلاء باقی ہے اور وہ ہے معانی کا وجود یعنی ایک لفظ میں معانی کیسے اپنا وجود قائم کرتے ہیں۔

معنیٰ کیسے بنتا ہے؟

معنیٰ اپنی اصل میں ایک حقیقی مشاہدہ ہے لیکن یہ حقیقی مشاہدہ زیادہ دیر تک مشاہدہ نہیں رہتا بلکہ اِس میں وقت کے ساتھ ساتھ متنوع تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور

اِسی سے پھر یہ اصطلاح، روزمرہ، محاورہ، تشبیہ اور استعارہ بن جاتا ہے۔ پراکرت کا ایک عام لفظ ہے "لُچّا"۔ یہ لفظ اپنی اِسی شکل میں آج بھی ہندی، اُردو، پنجابی اور سرائیکی میں استعمال ہوتا ہے۔ لُچ اصل میں درخت کی ٹہنی میں جو خاص طرح کا بل (Tangle) ہوتا ہے اُسے کہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقی مشاہدہ ہے۔ پھر اِسی سے یہ لفظ کسی بھی قسم کے اُلجھاؤ کیلئے استعمال ہونے لگا۔ مثلاً کپڑے میں گانٹھ کو بھی لُچ کہا جانے لگا۔ چنانچہ کوئی بھی لفظ جب تک حقیقی مشاہدہ تک محدود رہے وہ لفظ ہی رہتا ہے لیکن جیسے ہی اُس میں کوئی مزید تاثر (Impression) شامل ہو جائے تو اصطلاح (Term) بن جاتا ہے۔ تاثر سے مراد یہ ہے کہ ایک نیا مشاہدہ سامنے آ گیا ہے لیکن اِس کیلئے پہلے سے موجود کوئی لفظ نہیں مل رہا تو بااَمرِ مجبوری مستعمل لفظ میں یہ تاثر شامل کر دیا جائے۔

کلمہ کیسے بنتا ہے؟

لفظ اگر بامعنٰی ہے تو وہ کلمہ بن جاتا ہے۔ مثلاً پانی کلمہ اور وانی لفظ ہے۔ پانی بامعنٰی ہے یعنی مخاطب اِس سے واقف ہے اور وانی مہمل ہے یعنی اِس کا کوئی مطلب نہیں۔ لفظ کو انگریزی میں Word اور کلمہ کو Morpheme کہتے ہیں۔ دنیا کی ہر زبان میں لفظ اور کلمہ استعمال ہوتے ہیں اور ہر زبان میں کلمہ کی صرف تین ہی اقسام ہوتی

ہیں۔ اسم۔ فعل۔ حرف۔ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اسم (Noun) اور فعل (Verb) کا تصور موجود ہے۔ اس کی وجہ منطقی ہے یعنی انسان کو بات کرنے کیلئے کسی "چیز" یا "ہستی" کا ذکر کرنا ہوتا ہے اِسی سے اسم بنتا ہے جبکہ اُس ہستی کے کسی "عمل" یا "حالت" کو بیان کرنا ہوتا ہے اِسی سے فعل بنتا ہے۔ بہت کم ایسی زبانیں ملی ہیں جن میں اسم اور فعل کے درمیان فرق بہت دھندلا ہو، لیکن مکمل خاتمہ بہر حال کہیں نہیں ملتا۔

اگر ہم قواعد کی باریکیوں سے ہٹ کر منطقی طور پر دیکھیں تو کائنات کی ہر حقیقت یا تو ایک ذات ہے یعنی اسم یا ایک صفت یا حالت یعنی فعل اور اِن دونوں کے درمیان تعلق قائم کرنے کیلئے کسی ربط کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ربط حرف ہے۔ اِسی لئے انسانی ذہن لاشعوری طور پر ہر زبان میں اِن تین بنیادوں کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھتا ہے۔

نحو کیسے بنتی ہے؟

چند کلمات کا آپس میں جُڑ کر ایک مکمل جملہ بنا دینا نحو کہلاتا ہے یعنی نحو دراصل الفاظ کی بامعنٰی ترتیب کا نام ہے۔ نحو کو انگریزی میں Syntax کہا جاتا ہے اور یہ تکنیک دنیا کی ہر زبان میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ نحو کے بغیر دنیا کی کسی بھی زبان میں کوئی

بامعنیٰ جملہ نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ نحو کے بغیر کوئی بھی زبان "زبان" نہیں کہلاتی بلکہ وہ محض الفاظ کا ایک ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے۔ اِسے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح انسانی جسم کیلئے ہڈیوں کا ڈھانچہ ضروری ہے اِسی طرح ایک زبان کیلئے نحو ضروری ہے۔

دنیا کی ہر زبان میں ایک لفظ کام کیلئے مختص ہوتا ہے اسے فعل یعنی Verb کہا جاتا ہے۔ ایک لفظ کام کرنے والے کیلئے مختص ہوتا ہے اسے فاعل یعنی Subject کہا جاتا ہے جبکہ ایک لفظ اُس انسان یا شے کیلئے مختص کیا جاتا ہے جس پر کام ہو رہا ہو اِسے مفعول یعنی Object کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ اسم کی تعریف پڑھ آئے ہیں کہ یہ لفظ کسی خاص شخص یا ضمیر (Noun or Pronoun) اور صفت یا کیفیت (Adjective or State) کیلئے مختص ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ کچھ حروف یعنی Particles ایسے ہوتے ہیں جو اسم، فعل، فاعل اور مفعول کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ یہ حروف عموماً حروفِ ربط یعنی Prepositions، حروفِ عطف یعنی Conjunctions، حروفِ فجائیہ یعنی Interjections حروفِ توکید یعنی Determiners اور حروفِ نفی و استفہام یعنی

Negative and Interrogative Particles کہلاتے ہیں۔

اب ایک جملہ دیکھیں۔

"اسلم نے زید کو بہت مارا ہے"۔

"اسلم "فاعل ہے۔ "نے "حرفِ ربط ہے۔ "زید" مفعول ہے۔ "کو" حرفِ ربط ہے۔ "بہت" اسمِ کیفیت ہے۔ "مارنا" فعل ہے۔ "ہے" معاون فعل ہے جسے انگریزی میں Auxiliary Verb کہتے ہیں اور یہ فعل ہی کی ایک قسم ہے۔ بالکل ایسے ہی ہر زبان میں نحو بنتی ہے۔

اصطلاح کیسے بنتی ہے؟

کوئی لفظ جب اپنے حقیقی مشاہدہ کے ساتھ کسی اور تاثر کا بوجھ اُٹھالے تو وہ اصطلاح بن جاتی ہے۔ مثال سے سمجھیں۔

جیسا ہم معنٰی کے عنوان میں عرض کر چکے کہ لُچ اپنی اصل میں ایک حقیقی مشاہدہ ہے اور جب تک یہ اُلجھاؤ کے معنٰی میں استعمال ہو گا تب تک یہ لفظ ہی رہے گا جیسے ہی اِس میں کوئی نیا تاثر شامل ہوا تو یہ باقاعدہ اصطلاح بن جائے گا۔ مثلاً لُچّا اسمِ فاعل ہے اور اب یہ لفظ نہیں رہا بلکہ اصطلاح بن چکا ہے کیونکہ اِس میں اب صرف اُلجھاؤ کا تاثر شامل نہیں بلکہ اِس میں ایک اور تاثر یعنی نفرت بھی شامل ہو گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ پرانے ویدک دَور میں ہندو معاشرے پر پنڈتوں کی مذہبی اور سماجی گرفت بہت مضبوط تھی یعنی کسی کی مجال تک نہیں تھی کہ اِن کے خلاف کوئی چوں تک منہ سے نکال لے لیکن آج سے پچیس سو سال پہلے مگدھ کی دھرتی پر ایک ایسا مہاراجا پیدا ہوا جس نے پنڈتوں کا سارا دھارمک پاکھنڈ یعنی مذہبی دھوکے دہی کو کھول کے رکھ دیا۔ یہ مہاراجا تھا جین مَت کا چوبیسواں تیرتھانکر وردھمان مہاویر۔ مہاویر مُول گیان پراپت یعنی اصل علم حاصل کرنے کی خاطر جنگلوں میں نکل پڑا۔ کھانا پینا ترک کر دیا۔ لباس سے بے نیاز ہو گیا اور اپنے وجود کو فطرت کے سپرد کر دیا۔ ایسی حالت میں اُس کے سر کے بال بڑھ کر سینے سے نیچے آ گئے اور دِقّت سے بچنے کیلئے اُس نے اپنے بالوں کو بل دے دیئے۔

چنانچہ جنگلی لوگ اِس ننگ دھڑنگ سادھو کو نہیں جانتے تھے اِس لئے اپنی سمجھ کی غرض سے مہاویر کو لُچّا کہنا شروع کر دیا یعنی ایسا شخص جو اپنے بالوں کو بل دے کے رکھتا ہے۔ پنڈت تو پہلے ہی اِس سے تپے ہوئے تھے اُنھوں نے مارے نفرت اور حقارت کے اِسی عام لفظ کو بدنام کر کے اِس میں اپنی نفرت و حقارت داخل کر دی۔ یعنی جنگلیوں کا وہ عام لُچّا سادھو اب پنڈتوں کا بدکردار دشمن بن گیا۔ چنانچہ اب لُچّا ایک عام مشاہداتی لفظ نہیں رہا بلکہ پنڈتوں کی اصطلاح بن گئی۔ لُچّا اپنی اصل میں وہ شخص ہے جو اپنے بالوں کو بل دے کے رکھتا ہے لیکن کیا آج آپ کسی شریف آدمی

کو لُچّا کہہ سکتے ہیں؟۔ پس معنیٰ یعنی حقیقی مشاہدہ ہے اور جب تک یہ حقیقی مشاہدہ تک محدود رہے یہ معنیٰ ہے۔

روزمرّہ کیسے بنتا ہے؟

جب حقیقی مشاہدہ کسی نقش کے وسیلے سے ابلاغ کی ذمہ داری سرانجام دے تو وہ لفظ کہلاتا ہے جبکہ اگر الفاظ دو یا دو سے زائد الفاظ ہوں تو یہ روزمرہ بن جاتے ہیں۔ روزمرہ کو انگریزی میں عموماًColloquial کہا جاتا ہے۔ لفظ کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف ایک مجرد نقش ہو لیکن روزمرہ کیلئے یہ شرط نہیں بلکہ یہ دو یا دو سے زائد الفاظ بھی ہو سکتے لیکن بنیادی تفہیم دونوں کا ایک ہی رہے گا یعنی حقیقی مشاہدہ کا ابلاغ۔ روزمرہ اہلِ زبان اپنی ضرورت کے مطابق بناتے ہیں اور اِس میں کوئی غیر اہلِ زبان ذرا سی بھی تبدیلی و تغیر نہیں کر سکتے۔ مَیں چونکہ اُردو کا اہلِ زبان نہیں ہوں اور نہ ہی یہ میری مادری زبان ہے اِس لئے مَیں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی بہت عام سا ایک روزمرہ عرض کر دوں تاکہ سمجھ آ سکے ورنہ سرائیکی میں تو بے شمار روزمرہ ہم روز بولتے ہیں۔ اُردو کا ایک عام روزمرہ ہے "آنکھیں دِکھانا"۔ یہ اپنے حقیقی مشاہدہ میں بھی ایسا ہی ہے کہ جب کسی کو غصّہ کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے اُس کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ اِسی تاثر کو اہلِ زبان نے صرف دو الفاظ

میں بہت جامعیت کے ساتھ پِرو دیا۔ روزمرہ کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ اِسے صرف اہلِ زبان ہی وضع کر سکتے ہیں اور اہلِ زبان ہی اِس میں تغیر و تبدل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی غیر اہلِ زبان کو یہ حق نہیں حاصل ہوتا کہ وہ اُس غیر زبان میں اپنی مرضی کے دو یا تین الفاظ جوڑ کر روزمرہ پیدا کر دے۔

ہمارے ہاں پنجابی، سرائیکی اور پشتون اُردو اَدیبوں کو ہمیشہ سے یہ دقّت رہی کہ چلو محاورہ تو ہم لغات کی وساطت سے اہلِ زبان سے لے لیں گے لیکن روزمرہ کا کیا کریں گے۔ اِس کا پھر سادہ حل یہ نکالا کہ پنجابی اور فارسی زبان میں موجود مقامی روزمرہ جات کو اُردو قالب میں ڈال لیا اور یوں ایک مصنوعی سی اُردو ہم نے اِدھر پاکستان میں بیٹھے بٹھائے بنادی۔

اِس معاملے میں مجھے اِس وقت ایک بہت دلچسپ لطیفہ یاد آرہاہے۔

کہتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اپنے مقالات میں عربی لفظ زِنا کو اکثر مؤنث لکھا کرتے۔ اِس کی خبر اُردو کے معروف نقّاد ماہر القادری کو ہوئی تو مولانا کو خط لکھ کر تصحیح کرنا چاہی کہ دیکھئے مولانا آپ زنا کو مؤنث لکھتے ہیں جبکہ لغت کے حساب سے یہ مذکر بولا جاتا ہے اور ساتھ کچھ لغات یعنی فرہنگِ آصفیہ وغیرہ کے حوالے بھی بھیج دیئے۔ مولانا نے جواب لکھ بھیجا کہ بھائی ہم دلّی والے اپنے گھروں

میں ایسے ہی بولتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اُردو ہمارے گھر کی زبان ہے اور اِس میں تصرّف ہمارا حق ہے۔ آپ لغت والوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی تصحیح کر لیں۔

محاورہ کیسے بنتا ہے؟

جب کوئی دو نقوش یعنی الفاظ اپنے حقیقی مشاہدہ کا اظہار کریں تو یہ روزمرہ اور اگر حقیقی مشاہدہ کے علاوہ کسی مزید تاثر کا اظہار کرنے لگیں تو یہ محاورہ بن جاتا ہے۔ محاورہ کو انگریزی میں Idiom کہا جاتا ہے۔ مثلاً "ہاتھ دھو بیٹھنا"۔ یہاں ہاتھ دھو بیٹھنے سے مراد حقیقی مشاہدہ مراد نہیں بلکہ ایک اضافی تاثر ہے جو اہلِ زبان نے اِن الفاظ میں داخل کر دیا ہے۔ چنانچہ جب کوئی اہلِ زبان کہتا ہے کہ مَیں نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھا تواُس کے کہنے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ مجھے ملازمت سے برخواست کر دیا گیا۔ روزمرہ کی طرح محاورہ کے بھی نہ تو الفاظ بدلے جاسکتے ہیں اور نہ ہی تاثر۔ کسی بھی زبان میں جملہ تصرفات کا بلا شرکتِ غیرے حق صرف اور صرف اہلِ زبان کو حاصل ہوتا ہے۔ غیر اہلِ زبان نہ تو دو یا دو سے زائد الفاظ جوڑ کر روزمرہ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی محاورہ۔ محاورہ کی افادیت یہ ہے اِس کے وسیلے سے ہم ایک ہی وقت میں بہت سارے الفاظ کے استعمال سے بچ جاتے ہیں اور دو یا دو سے زائد الفاظ کا سہارا لیکر اپنا مدعّا مخاطب تک پہنچا دیتے ہیں۔

تشبیہ کیسے بنتی ہے؟

تشبیہ کہتے ہیں کسی ایک لفظ کے حقیقی مشاہدہ کو کسی دوسرے لفظ کیلئے اُدھار لے لینا مثلاً جب اہلِ زبان کہتے ہیں کہ "چاند جیسا چہرہ" تو یہاں چاند کے حقیقی مشاہدات یعنی گولائی اور روشنی اُدھار لیکر کسی انسان کے چہرے کو سونپی جارہی ہے۔ تشبیہ کو انگریزی میں Simile کہا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں ہمیں یہ تاثر ملتا ہے۔ زبان کوئی بھی ہو اِس کی مبادیات کبھی نہیں بدلتیں چنانچہ ہندی ہو یا پنجابی انگریزی ہو یا عربی سرائیکی ہو یا فرانسیسی بنیادی اُصول ایک ہی رہتے ہیں۔ تشبیہ کسی بھی زبان کا بلاغتی حُسن ہوتا ہے۔ ہم تشبیہات کے ذریعے سے مختلف الفاظ کے تاثرات آپس میں ایک دوسرے سے اُدھار لیکر اپنی زبان کو مہذب کرتے چلے جاتے ہیں۔ تشبیہ زبان کا جزلاینفک ہے۔

اِستعارہ کیسے بنتا ہے؟

ایک لفظ کے حقیقی مشاہدہ کو کسی دوسرے لفظ کیلئے اُدھار لینا تشبیہ ہے تو اُسی نقش یعنی لفظ کو اُس کی ذات اور صفات سمیت اُدھار لینا استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارہ کو انگریزی میں Metaphor کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب ایک اہلِ زبان کہتا ہے "زید تو میرا چاند ہے" تو یہاں نقش چاند اپنے تمام تر تاثرات کے ساتھ ایک اسم یعنی زید

میں پورے کا پورا داخل ہو چکا پس یہاں نہ صرف چاند کی گولائی اور روشنی بلکہ اِس کی اپنی ذات یعنی لفظ چاند بھی اُدھار پر چلا گیا۔ دنیا کی ہر زبان استعارات سے بھری پڑی ہے اور ہر زبان کے اپنے مخصوص استعارات ہوتے ہیں۔

یہ اہلِ زبان کی ضرورت اور طبیعت پر منحصر ہے کہ کب کس نقش یعنی لفظ کو استعارہ بنا دیں۔ اب زبان کی تمام بنیادی اکائیوں کو سمجھنے کیلئے مَیں یہاں پر صرف ایک لفظ کے وسیلے سے مذکورہ تمام اکائیاں ایک ساتھ واضح کر دیتا ہوں تاکہ ذہن نشین ہو جائیں۔

سب سے پہلے حقیقی مشاہدہ پر مبنی نقش یعنی "مٹی"۔ مٹی سے مراد کوئی بھی مٹی جسے ہم استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ ہے۔

پھر اصطلاح بنتی ہے تو اہل زبان کہتے ہیں کہ "میری مٹی تُو گواہ رہنا" تو یہاں اب مٹی سے مراد وطن ہے۔ یہ اصطلاح ہے۔

پھر جب اہلِ زبان کہتے ہیں کہ " ہم زید کی قبر پر مٹی ڈال آئے " تو یہاں مٹی سے مراد اب خشک مٹی ہے جو قبر پر ڈالی جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں مٹی کی ذات تبدیل نہیں ہوئی صرف صفت تبدیل ہوئی یعنی وہ گیلی مٹی نہیں تھی بلکہ خشک مٹی تھی۔

یہ روزمرہ ہے۔

پھر جب اہلِ زبان کہتے ہیں کہ "مٹی ڈالو اِس کام پہ" تو یہاں مٹی میں ایک اضافی تاثر داخل کر دیا گیا۔ مطلب چھوڑ دو اِس کام کو۔ یہ محاورہ ہے۔

پھر جب اہلِ زبان کہتے ہیں کہ زید نے "مٹیالے رنگ کا لباس پہنا ہوا ہے" تو یہاں اب مٹی کی صفت کو لباس پر منطبق کر دیا گیا۔ یہ تشبیہ ہے۔

پھر جب اہلِ زبان کہتے ہیں کہ "تم نے ہمیں مٹی کر دیا" تو یہاں اب مٹی اپنی ذات اور صفات کے ساتھ اُدھار لے لی گئی یعنی ہم برباد ہو گئے۔ یہ استعارہ ہے۔

☆☆☆☆☆

متن کی تشکیل

کسی بھی زبان کا بنیادی مظہر متن کہلاتا ہے۔ متن کو انگریزی میں Text اور اِس کی تشکیل کو Construction کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک لفظ سے لیکر ایک لاکھ الفاظ تک کا مجموعہ متن کہلاتا ہے۔ متن کی تخصیص بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ابتداء میں کسی بھی زبان کا عام اظہار متن کہلاتا تھا۔ اب یہ لفظ لسانیات کی ایک مسلّمہ اصطلاح بن گئی ہے اور اِس کا مطلب ہے مذہب و اَدب کا کوئی خاص مجموعہ جسے تعبیرات کے مسائل درپیش ہوں۔

متن کی تشکیل زبان کا سب سے اہم اور بنیادی معاملہ ہے اور اِس کے بغیر کوئی بھی زبان اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ متن میں بنیادی کردار انتخابِ الفاظ کا ہوتا ہے جسے انگریزی میں Diction کہتے ہیں۔ یہ انتخابِ الفاظ کوئی معمولی مرحلہ نہیں ہوتا بلکہ یہی اصل میں متن کا مدّعا اور مخاطب کا مقام طے کرتا ہے۔ انتخابِ الفاظ کے سبب متن کی حیثیت طے ہوتی ہے کہ یہ متن کس موضوع اور کس مخاطب کیلیئے وضع کیا گیا ہے۔ مثلاً ہم مہمان کو خوش آمدید جناب کہتے ہیں اور چور کو دفع ہو جاؤ بدبخت کہتے ہیں۔ متن میں الفاظ، اصطلاحات، روزمرہ جات، محاورہ جات، تشبیہات اور استعارات کا چناؤ ہی اصل میں متن کے اندر حقیقی روح پیدا کرتے

ہیں۔ چنانچہ فصاحیّت (Eloquence)، بلاغیّت (Rhetoric)، جامعیّت (Brevity)، سلاسیّت (Lucidity)، سجاعیّت (Assonance)، قافیّت (Versification) متن کی خوبیاں جبکہ ثقالیّت (Magniloquence)، طوالیّت (Prolixity)، مصنوعیّت (Artificiality) اور اِبہامیّت (Ambiguity)متن کی خامیاں کہلاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

سیاق و سباق

کسی متن کا اصلی ماحول سیاق و سباق کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اِسے Context کہا جاتا ہے۔ ایک جملہ دیکھیں۔

"سلیم نے زید کو منع کیا کہ بارش کے دنوں میں میرے گھر مت آیا کرو"۔

اِس متن کا ماحول بتارہا ہے کہ سلیم نے زید کو صرف بارش کے دنوں میں گھر آنے سے منع کیا نہ کہ عام دنوں میں یعنی عام دنوں میں زید سلیم کے گھر جا سکتا ہے۔ کوئی بھی متن صرف اپنے ماحول کا تابع ہوتا ہے چنانچہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بھی نیا مخاطب متن میں اپنی پسند کا ماحول ڈال دے۔ اصل میں متن اور اُس کے اصلی مخاطب کے درمیان ایک غیر اعلانیہ معاہدہ پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے اور یہی معاہدہ سیاق و سباق کہلاتا ہے۔ یعنی اگر ہم درج بالا متن کو دیکھیں تو یہ الفاظ بولنے کے بعد زید کو سلیم سے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ زید پہلے ہی سے سمجھ چکا کہ بارش کے دنوں میں اب سلیم کے گھر نہیں جانا۔ چنانچہ جب تک متن کا اصلی مخاطب موجود ہے غیر اعلانیہ معاہدہ بھی موجود ہے جیسے ہی مخاطب بدلتا ہے غیر اعلانیہ معاہدہ اب ظاہر ہو کر سیاق و سباق کی صورت اختیار کر لیتا ہے حالانکہ اِس کی ضرورت اصلی مخاطب کو کبھی پیش ہی نہیں آئی۔

کوئی بھی متن مشاہدات و تجربات کا ایک زندہ و متحرک عکس ہوتا ہے جسے ہم آجکل کی اصطلاح میں ویڈیو کلپ کہہ سکتے ہیں اور یہ متن اپنے باطن میں ایک مستقل ماحول لئے کھڑا ہوتا ہے تو کسی بھی نئے مخاطب کو اُس ماحول کے ساتھ خود کو موافق (Compatible) کرنا پڑتا ہے۔ اگر نیا مخاطب متن کے اصلی ماحول کو تحلیل کرکے اپنی مرضی کا ماحول متن میں داخل کرنا چاہے تو ایسی صورت میں متن اپنی روح سے محروم ہو کر مخاطب کے فہم کا اسیر ہو جاتا ہے۔ پس متن کے ساتھ اِس سے بڑی زیادتی علم کی دنیامیں ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے متون صرف اِس بنیاد پر علمی جدل کی نذر ہو جاتے ہیں کہ نیا مخاطب اُن کا اصلی ماحول بدل دیتا ہے۔ یہ زبان کا وہ پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اگر اِسے گہرائی سے نہ سمجھ لیا جائے تو بڑے سے بڑا عالم اور محقّق بھی سخت ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ متن کا سیاق وسباق متن کی روح ہے فلہٰذا متن کی اپنی روح اُس کے وجود سے نکال کرنا ایک نئی روح ڈال دینے سے متن ایسا جسم بن جاتا ہے جس میں متن کی اپنی روح نہیں بلکہ مخاطب کی ڈالی گئی مصنوعی روح ہوتی ہے۔ یہ صورت خاص اُس وقت پیش آتی ہے جب کوئی نیا مخاطب کسی متن کا اصلی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ (Translation) کرنے لگتا ہے۔ ترجمہ کی ضرورت ہی اُس وقت پیش آتی ہے جب متن کے نئے مخاطب پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ کسی

بھی شخص کی دو مادری زبانیں تو ہو نہیں سکتیں اِس لئے یہ ضروری نہیں کہ متن کا اصلی مخاطب ہی متن کا مترجم بھی ہو، پس ایسی صورت میں اِس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ مترجم متن کے اصلی ماحول کے آس پاس کا ایک مصنوعی ماحول خود سے وضع کر کے متن کو ایک دوسری زبان میں منتقل کر دے۔ پس متن کا کسی دوسری زبان میں مصنوعی ماحول کے ساتھ انتقال ترجمہ کہلاتا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا کہ متن کا اصلی ماحول ہی دراصل متن کی روح ہوتا ہے چنانچہ اِس اصلی ماحول کی اطاعت متن کا اصلی مخاطب ہی کماحقّہٗ کر سکتا ہے۔ نئے مخاطبین کے بڑے مسائل ہوتے ہیں جن میں سے سب سے سنگین مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ متن کے اصلی ماحول سے اپنے شعور کو موافق نہیں کر پاتے اور باامرِ مجبوری متن کے اندر سے اصلی ماحول نکال کر اپنا مصنوعی ماحول داخل کر دیتے ہیں تا کہ اپنے شعور کو کسی حد تک متن کے موافق کر لیں۔ اِسی کو لسانیات میں سیاق و سباق کی مجبوری بھی کہا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اہلِ زبان کا تصرّف

کوئی بھی زبان دراصل بلا شرکتِ غیرے صرف اہلِ زبان کی ملکیت ہوتی ہے اور اِس میں کسی بھی غیر اہلِ زبان کو تصرّفات کا حق نہیں ہوتا حتیٰ کہ اگر کسی زبان کے اسلوب میں اختلاف ہو جائے تو اُس زبان کا ہر ہر اسلوب اہلِ زبان کے ہاں معتبر و مستند ہے اور کسی ایک کو دوسرے کے اسلوب کی اطاعت کرنا ضروری نہیں ہوتی۔ اہلِ زبان کے تصرّف کیلیئے انگریزی ترجمہ Possession of the Native Speakers بنتا ہے۔

مثلاً ہم کلاچیوالی سرائیکی جسے مقامی اصطلاح میں ہند کو کہتے ہیں میں چانڈا یعنی اُٹھانا کہتے ہیں جبکہ یہی لفظ ڈیریوالی سرائیکی میں چینڈا ہو جاتا ہے۔ دونوں بالکل درست اور مستند ہیں اور کوئی ایک دوسرے کے اسلوب کی اطاعت کا پابند نہیں۔

زبان ذاتی طور پر تو اہلِ زبان ہی کی ملکیت ہوتی ہے لیکن کوئی بھی غیر اہلِ زبان نہ صرف اِسے سیکھ سکتا ہے بلکہ چاہے تو اِس میں اپنی پسند کا اَدب بھی تخلیق کر سکتا ہے لیکن اِس میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ایسا کرنے سے غیر اہلِ زبان کو اہلِ زبان کے روزمرہ اور محاورہ کی اطاعت کرنا پڑتی ہے ورنہ اُس غیر اہلِ زبان کی زبان مصنوعی اور بعض اوقات بالکل جعلی بن جاتی ہے۔ اُردو اَدب میں اِس کی

سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ تقسیم کے بعد اُردو تو یوپی میں ہی رہ گئی چنانچہ یہاں کے ادیبوں کو جب اُردو میں لکھنے کا خبط سوار ہوا تو پنجابیوں، سرائیکیوں اور پشتونوں نے وہ شگوفے چھوڑے کہ اگر آج ہم اُن پر تنقیدی نظر ڈالیں تو مارے حیرت و استعجاب کے کچھ پلے نہیں پڑتا۔

زبان پر اہلِ زبان کے تصرّف کو سمجھنے کیلئے باقاعدہ ایک مثال کے ذریعے سے ہی وضاحت ہو سکتی ہے اِس لئے مثال ملاحظہ کریں۔ مَیں زیادہ دور کے ادیبوں کے کام نہیں چھیڑنا چاہتا بلکہ ہمارے اپنے دَور کے ایک نہایت مشہور و معروف، مستند اور پورے برصغیر میں پڑھے جانے والے ناول نگار کے ناول سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں، پھر اُس پر تنقید کروں گا تاکہ سمجھ آسکے کہ جب غیر اہلِ زبان کسی زبان پر ہاتھ صاف کرتا ہے تو وہ کس طرح زبان کا کچومر نکال کے رکھ دیتا ہے۔ یہ ناول نگار ہیں جناب علی اکبر ناطق اور اِن کے ناول جہلم کے شاہد برادران کے پبلشنگ ہاؤس بک کارنر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ملاحظہ کریں جناب ناطق کے ایک معروف ناول "کماری والا" کا پہلا پیراگراف۔

"یہاں ایک ویران اور کچی سڑک تھی۔ چاندنی رات کا دودھ اُبل رہا تھا اور دُور تک کھلے میدانوں کے دراز ہوتے سلسلے تھے۔ رات لاری سے جس وقت یہاں اُترا، غالباً

نو بجے تھے۔ آسمان اتنا شفاف اور ترو تازہ بھی ہو گا۔ یہ بات پچھلے 25 برسوں میں ایسے بھول گئی کہ پھر اُس کا تصور بھی ختم ہو گیا تھا۔ چاند کے آس پاس کے تارے تو پھیکے تھے مگر اِس آسمانی چھجے کے کناروں والے ایک ایک تارے کی شکل اور اِس کا مزاج کسی تجربہ کار آدمی کے دوستوں کی طرح نکھرا ہوا تھا۔ جیسے مَیں ہزاروں سال سے اِنہیں جانتا ہوں۔ چاند تانبے کے تھال کی طرح دہک رہا تھا"۔

(کماری والا۔ صفحہ۔9۔ مطبوعہ۔ بک کارنر، جہلم۔ سنِ اشاعت۔ جنوری 2021ء)

پورا پیرا گراف مصنوعیّت سے لبریز ہے۔ چاندنی رات کا دودھ اُبلنا سرے سے اُردو کا کوئی محاورہ ہی نہیں ہے اور کسی بھی غیر اہلِ زبان کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ قلم اُٹھا کر جس وقت چاہے اپنی مرضی کے محاورے گھڑ لے۔ البتہ چاندنی رات اُردو کا ایک عام مستعمل روزمرہ ہے۔ "دُور تک" کوئی روزمرہ نہیں بلکہ درست روزمرہ "دُور دُور تک" ہے۔ تاروں کا پھیکا ہونا بھی کوئی محاورہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بالکل من گھڑت مرکب ہے۔ البتہ "تاروں کا مدھم" ہونا ایک عام روزمرہ ہے۔ "آسمانی چھجہ" پنجابی کا محاورہ ہے نہ کہ اُردو کا۔ تارے کی شکل درست ترکیب ہے لیکن تارے کا مزاج یہ صفت غیر ذوالعقول ہے جو زبان میں فصاحت کو پامال کرتی ہے۔ علاوہ ازیں تارے کے مزاج کی تجربہ کار کے دوست سے تشبیہ باطل ہے۔

چاند کو تانبے کے تھال سے تشبیہ دینا اور پھر تانبے کے تھال کو دہکنا یعنی آگ کے اَلاؤ سے تشبیہ دینا یہ پورا جملہ ہی باطل ہے۔ چاند کی تانبے کے تھال سے تشبیہ اِس لئے باطل ہے کہ تانبے کے تھال میں کوئی بھی ایسی صفت نہیں پائی جاتی جس سے چاند کو مماثل قرار دیا جائے۔ علاوہ ازیں پھر تانبے کے تھال کو آگ کے اَلاؤ سے تشبیہ دینا ایک الگ سے بطل ہے۔ تانبے کا تھال کیوں دہکے گا جبکہ اُس کی صفات میں نہ تو کوئی حرارت موجود ہے اور نہ ہی آگ کی کی تپش؟۔

اندازہ لگا لیں، یہ ہمارے دَور کا ایک نہایت معروف اور معتبر ناول نگار ہے اور اِس کے ناول انگریزی میں بھی ترجمہ ہو کر پڑھے جا رہے ہیں۔ اصل میں قصور ناطق کا نہیں ہے کیونکہ ناطق نے اپنی تخلیقات کیلئے جس زبان کا انتخاب کیا ہے وہ اُس کی اپنی زبان نہیں۔ ناطق کی مادری زبان پنجابی ہے۔ میرے خیال میں ناطق یہی ناول اگر پنجابی میں لکھتے تو یہ پنجابی اَدب کا ایک شاہکار ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ کوئی زبان اپنی کیسے بنتی ہے اور اِس پر تصرّف کیسے حاصل ہوتا تو اِس کا سادہ جواب یہ ہے کہ جو زبان آپ کی امّاں اور نانی امّاں کی زبان ہے وہی آپ کی اپنی زبان ہے۔ نانی کی شرط اِس لئے کہ ممکن ہے آپ کی امّاں سے آپ کی نانی نے اُردو میں بات کی ہو بچپن میں، چنانچہ صرف اِس طرح سے کوئی بھی غیر زبان سکھا

دینے سے وہ مادری زبان نہیں بن جاتی بلکہ اُس میں دو نسلوں کا تسلسل ہونا ضروری ہے تاکہ اُس زبان پر تصرف کا حق آپ کو حاصل ہو جائے۔ اگر آپ کی مادری زبان اُردو ہے اور نانی کی زبان پنجابی تو اصل میں آپ کی زبان پنجابی ہے نہ کہ اُردو۔ علامہ محمد اقبال کی مادری زبان پنجابی تھی لیکن لکھا آپ نے فارسی نما اُردو اور فارسی میں ہے۔ پھر کیا ہوا۔ آج علامہ کا کلام سمجھنے کیلئے فیروز للغات کے بغیر چارہ نہیں۔

آپ چاہیں تو اپنی مرضی کی کوئی بھی زبان گھڑ سکتے ہیں مگر وہ ہوگی صرف آپ کی اپنی مصنوعی زبان جسے زندہ رکھنے کیلئے قواعد اور لغات کا سہارا لینا پڑے گا۔ پاکستان کے زیادہ تر ادیب اور شاعر پنجابی اور سرائیکی ہیں، کوئی ایک آدھ پشتون اور ہندکو ان بھی ہے لیکن سب کی اپنی اپنی اُردو ہے اور کسی ایک ادیب کی بھی اُردو دوسرے ادیب سے میل نہیں کھاتی کیونکہ اِن سب میں کسی ایک کی بھی ماں اور نانی کی زبان اُردو نہیں ہے۔

زبان کے حوالے سے یہ انتہائی اہم بات ہمیشہ ذہن میں مستحضر رکھیں کہ زبان فیروز للغات پڑھ کر نہیں آتی، نہ لکھی جاتی ہے۔ قواعد اور لغات صرف غیر اہلِ زبان کو اِس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ اہلِ زبان کے اصطلاحات، روزمرہ جات، محاورہ جات، تشبیہات اور استعارات سے واقف ہو جائیں کہ اہلِ زبان اِس طرح بولتے

ہیں۔ قواعد اور صَرف و نحو سے محض کسی زبان کے کچھ بنیادی اُصول تو معلوم ہو جاتے ہیں ،علاوہ ازیں قواعد کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ قواعد اور لغات سے سیکھی جانے والی زبان ایک مصنوعی اور مُردہ زبان ہوتی ہے جسے بعض اوقات خود اہلِ زبان کیلئے سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم پاکستانیوں کی اُردو، فارسی اور عربی وہ مُردہ اور مصنوعی زبانیں ہیں کہ جنہیں آج خود یوپی، عرب اور فارس کے لوگ بھی نہیں سمجھ پاتے۔ ہماری اپنی زبان صرف وہ ہے جو ہماری امّاں اور نانی امّاں کی زبان ہے۔

☆☆☆☆☆

مصنّف کی موت

جیسا کہ عرض ہو چکا کہ کسی بھی زبان میں سب بنیادی مظہر متن ہوتا ہے اور پھر متن کے بعد زبان کا پہلا حادثہ شروع ہو جاتا ہے۔ مصنف کی موت جسے انگریزی اصطلاح میں The Death of the Author کہا جاتا ہے دراصل متن اور اُس کے خالق کے درمیان ایک اذیت ناک انقطاع یعنی Disconnection ہے جو زبان کو ایک مذاق بنا کے رکھ دیتا ہے۔

مصنف جب کسی زبان میں کوئی متن تخلیق کرتا ہے تو اُس کے سامنے اپنے مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ و معانی۔ الفاظ و معانی کا سہارا تو وہ ابلاغ کی خاطر باَامرِ مجبوری لے لیتا ہے کہ اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں لیکن ایک بار جب متن تخلیق ہو گیا تو ٹھیک اُسی لمحے مصنف کی اَدبی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ اِس کے بعد مصنف کی طبعی موت تک وہ متن مصنف کی اپنی گرفت میں نہیں رہتا بلکہ قاری کے اپنے فہم و ادراک کے رحم کرم پر رہ جاتا ہے۔ پس مصنف کی قانونی موت جس کا کُل دورانیہ آئینِ پاکستان کے مطابق پچاس سال ہے، اِس عرصے کے بعد مصنف کا متن پبلک ڈومین یعنی عوامی ملکیت بن جاتا ہے پھر جو چاہے مصنف کے متن میں قطع وبُرید، حک ّو اضافہ اور ترمیم و تنقیح کر سکتا ہے۔ زبان کا یہ بدترین

حادثہ ہے اور اِسی حادثہ کے سبب نہیں کہا جا سکتا یقین سے کہ اِس وقت ہمارے پاس کوئی ایسا متن بھی موجود ہے جس پر معاشرے نے ہاتھ صاف نہ کئے ہوں۔ البتہ ہمارا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ فلاں متن گردِ زمانہ سے محفوظ رہا ہے لیکن اِس کی کوئی قابلِ تجربہ دلیل ممکن نہیں۔ متن کو بچانے کی خاطر کچھ اقدام پرانے وقتوں میں لئے جاتے تھے یعنی اِسے حافظہ میں محفوظ کر کے آگے کی نسل کو منتقل کر دینا لیکن حفظ کا یہ مسلّمہ تواتر بھی تجرباتی یقین نہیں دیتا کہ کسی زمانے میں متن میں ردّ و بدل نہیں ہوا ہو گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے ہی نہیں کہ فلاں متن اپنی اصلی حالت میں ہمارے پاس موجود ہے یا نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ متن ایک خاص علاقے، خاص وقت اور خاص مخاطبین کیلئے وضع کیا گیا اور اِن میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں یعنی نہ وہ وقت نہ وہ زبان نہ وہ مخاطب اور نہ اُس کا مصنف موجود رہا۔ اب ایسی صورت میں بالفرض اگر متن محفوظ بھی ہے تو کیا فائدہ۔

ارسطو نے اَدبی تنقید کی اپنی معروف کتاب بوطیقا (Poetics) میں ایک یونانی لفظ استعمال کیا ہے جسے بعد میں انگریزی میں ترجمہ کر کے Mimeses لکھا گیا۔ آج تک یہ بحث چل رہی ہے کہ اصل میں یہ لفظ ہے یا کوئی اصطلاح، روزمرہ ہے یا کوئی محاورہ، تشبیہ ہے یا استعارہ۔ ہر انگریز ادیب مترجم نے اِس لفظ کو انگریزی زبان میں اپنے معانی پہنائے۔

بوطیقا کا اُردو ترجمہ کیا گیا تو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے پروفیسر عزیز احمد نے بوطیقا کا اُردو ترجمہ "فنِ شاعری" کیا اور Mimeses کا ترجمہ " نقل" کیا۔ ایک دوسرے اَدیب شمس الرحمان فاروقی نے بوطیقا کا اُردو ترجمہ "شعریات" کیا اور Mimeses کا اُردو ترجمہ "نمائندگی" کیا۔

خدا جانے کہ ارسطو نے Mimeses کا لفظ یا اصطلاح اپنے کونسے مشاہدہ و تجربہ کو سامنے رکھ کر لکھی ہو گی۔ اب نہ تو وہ وقت ہے نہ وہ زبان نہ ہی وہ مخاطب جن کیلئے ارسطو نے یہ مقالہ لکھا تھا۔ یہ تو ایک بہت سادہ سی مثال ہے، علاوہ ازیں متن کے حوالے سے سینکڑوں ایسی امثال دنیا کے ہر متن سے دی جاسکتی ہیں۔

قصّہ یہ کہ جب تک اہلِ زبان زندہ ہیں، زبان بھی زندہ ہے اور اُس کا متن بھی۔ بھلے تب مصنف کی اَدبی موت بھی واقع ہو جائے۔ مصنف آخر ایک زبان میں کلام کرتا ہے تو وہ زبان اہلِ زبان سے کیونکر اجنبی رہ سکتی ہے البتہ معانی کے معاملے میں اختلاف تب بھی ممکن ہے جس پر ہم اگلے باب میں باقاعدہ بحث کریں گے لیکن مجموعی طور پر متن اور اہلِ زبان کا ایک تعلق قائم رہتا ہے۔ چنانچہ کوئی بھی مصنف جب تک اہلِ زبان کی عام بول چال کی اطاعت کرتا رہتا ہے اُس کا متن اہلِ زبان کے دل و دماغ سے گزرتا رہتا ہے پس جب مصنف اہلِ زبان کی اطاعت سے

روگردانی کرکے اپنی ایک بالکل مختلف زبان گھڑنا شروع کر دے تو وہ اپنے ساتھ ٹھیک اُسی وقت متن کا بھی قتل کر دیتا ہے۔ بالکل یہی صورتحال تقسیمِ ہند کے بعد ہمارے ہاں کے اُردو ادیبوں کو درپیش رہی۔

ایک پنجابی اپنے گھر میں، بازار میں، گلی محلے اور سکول کالج میں پنجابی بولتا ہے لیکن جب وہ رات کو لکھنے بیٹھتا ہے تو اُردو میں لکھنا شروع کر دیتا ہے، بتایئے اب وہ اُردو کا روزمرہ اور محاورہ کہاں سے لے گا؟، یقیناً فرہنگِ آصفیہ اور علمی لغات سے تو پھر اِس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟، یہی نا کہ وہ ایک مصنوعی زبان خود گھر میں گھڑ کر ایسے مخاطبین کے سامنے پیش کر دے گا جو خود اِس کی طرح پنجابی ہیں۔ مصنف دیکھے گا کہ فرہنگِ آصفیہ میں لکھنؤ کا ایک روزمرہ لکھا ہوا ہے "دھیرج رکھیو"۔ اب وہ جلدی سے یہ روزمرہ اُٹھا کر اپنی تحریر میں ڈال دے گا لیکن جب یہی تحریر لکھنؤ پہنچے گی تو خود اہلِ زبان پڑھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ارے صاحب ہم تو یہ روزمرہ کب کا ترک کر چکے ہیں۔ زبان اپنی ذات میں مسلسل متحرک اور ایک بہتی ندی کی مانند ہوتی ہے۔ مصنف اِس میں غوطے لگا کر اپنی ضرورت کا پانی ڈھول میں بھر کر پھر اِس پانی کو اِس کے متلاشیوں کے سپرد کر دیتا ہے چنانچہ اب یہ متلاشیوں پر منحصر ہے کہ وہ اِسے کس استعمال میں لاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

معانی کا بحران

جیسے کہ ہم نے عرض کیا کہ مصنف متن لکھ کر اِس سے منقطع ہو جاتا ہے بالکل ایسے ہی پھر یہ متن اپنے آپ کو قاری کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معانی کا بحران یعنی متن ابھی تازہ ہے اور اِس کے اوّلین مخاطب ابھی زندہ ہیں لیکن متن کو سمجھنے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ معانی کا بحران پیدا ہی اُس وقت ہوتا ہے جب اہلِ زبان زندہ ہوں ورنہ تو متن تعبیرات کے گورکھ دھندے میں اُلجھ جاتا ہے۔ معانی کے اِسی بحران کو انگریزی میں Crisis of Semantics کہتے ہیں۔

کسی بھی متن کے پیچھے ایک زندہ زبان کھڑی ہے پھر اُس زندہ زبان کے پیچھے مصنف کے مشاہدات و تجربات کھڑے ہیں لیکن یہ متن جب اہلِ زبان کے پاس پہنچتا ہے تو اہلِ زبان اِس پر براہِ راست اپنی گرفت کَس لیتے ہیں یعنی وہ مصنف سے پوچھتے ہیں کہ صاحب آپ نے جو یہ لفظ "عشّاق" لکھا ہے اِس سے کون لوگ مراد ہیں اور ہم تو یہ لفظ "پاگلوں" کیلئے استعمال کرتے ہیں اور یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اِس صورتحال میں مصنف کس کس کو کہاں کہاں توضیح کرتا پھرے گا کہ "عشّاق" سے اُس کی مراد "پاگل" نہیں بلکہ "اصحابِ عزیمت" ہیں۔ یہی معانی کا بحران ہے۔

متن صرف الفاظ سے نہیں تشکیل پاتا اِس میں اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات بھی برتی جاتی ہیں تو ایسی صورت میں مصنف اپنے ہر قاری کو خود اُس کے پاس جا کر نہیں سمجھا جا سکتا کہ اُس کے نزدیک عشّاق لفظ نہیں بلکہ اصطلاح ہے اور اِس سے مراد پاگل لوگ نہیں بلکہ اصحابِ عزیمت ہیں۔ پس اِسی بنیادی اُلجھن کے سبب معانی کا بحران پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ زبان جو کچھ سمجھ رہے ہوتے ہیں متن اُس سے کچھ مختلف تصویر پیش کر رہا ہوتا ہے۔

اصلی زبان وہ ہوتی ہے جو ایک عام اہلِ زبان کے منہ میں ہوتی ہے نہ کہ کسی مصنف، ادیب یا شاعر کی زبان جسے وہ اپنے قلم سے نکالتا ہے۔ لیکن پھر مسئلہ یہ ہے کہ کچھ ایسے خیالات بھی موجود ہوتے ہیں کہ جن کے پیچھے کوئی مشاہدہ و تجربہ کار فرما نہیں ہوتا اور مصنف کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے خیالات کو اپنی زبان میں منتقل کر دے۔ چنانچہ جیسے ہی وہ اپنے غیر مرئی و غیر مجرّب خیالات کو الفاظ میں منتقل کرتا ہے تو اہلِ زبان کیلئے زبردست مشکل پیدا ہو جاتی ہے اور یہی مشکل بعد میں معانی کا بحران پیدا کر دیتی ہے۔ معانی کا بحران ناگزیر ہے کیونکہ عوام شاعر اور اَدیب نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی زبان شاعری اور اَدب کیلئے ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ اصلی زبان ہمیشہ بازار میں موجود ہوتی ہے جبکہ شاعر اور اَدیب خیالات کی دنیا میں غرق رہتے ہیں اِس لئے ایسی صورت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ پس اگر شاعر یا اَدیب

اپنے متن کو بازار کی زبان سے بچا کے رکھے تو یہ بچاؤ مصنوعی ہوتا ہے لیکن شاعر اور اَدیب اِس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا کیونکہ ضروری نہیں کہ کسی شاعر کے خیالات کی ترجمانی صرف بازار کی زبان ہی پوری طرح کر سکے۔ اِس لئے دنیا کا تمام تر اَدب اپنی بُنت میں عموماً مصنوعی ہوتا ہے کیونکہ اِس میں بازار کی زبان کا خاطر خواہ حصّہ نہیں ہوتا۔ مصنف کا عجیب المیہ ہوتا ہے کہ وہ جس طرح کی زبان سے اپنا متن تشکیل دیتا ہے وہ بازار کی زبان نہیں ہوتی لیکن پھر بازار والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اُس کا مدّعا خود ہی سمجھ لیں۔ پس مصنف کا یہی مطالبہ معانی کے بحران کی راہ ہموار کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

تعبیرات کا گورکھ دھندہ

معانی کا بحران اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب زبان زندہ ہو اور اُس کے مخاطب بھی لیکن تعبیرات کا گورکھ دھندہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب نہ تو زبان زندہ رہی اور نہ ہی اُس کے مخاطب، پس اگر کچھ ہے تو محض متن۔

جیسا کہ مَیں عرض کر چکا کہ کوئی بھی زبان کم و بیش چالیس سال کے عرصے کے بعد اپنے وجود اور اپنے حاملین و مخاطبین دونوں کے ساتھ غائب ہو جاتی ہے اور پھر اِس کے بعد اُس متوفیٰ زبان کا متن ہی رہ جاتا ہے۔ پس ایسے متن کو جب نیا قاری سمجھنے کی کوشش میں جس فہم تک پہنچتا ہے اُسے تعبیر یعنی Interpretation کہتے ہیں اور پھر تعبیرات کے اِس پورے اسلوب کو تعبیرات کا گورکھ دھندہ یا انگریزی میں Hermeneutics کہتے ہیں۔

اب تو دلّی کے معتبر اُردوداں گھرانے بھی کہتے ہیں کہ "اَجی ہم تو انگزائٹی کے پیشنٹ ہیں" جبکہ اِن کے بزرگ زندہ ہوتے تو اِن کی خوب خبر لیتے کیونکہ یہی جملہ آج سے اَسّی سال پہلے کچھ یوں بولا جاتا کہ "ارے صاحب ہمیں تو سوداویہ کا مرض لاحق ہے"۔ انگزائٹی اور سوداویہ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا شربت اور پانی میں ہے۔ اپنی ہیئت کے لحاظ سے تو دونوں مائع ہیں لیکن کہاں پانی اور کہاں شربت۔

آج کی نفسیاتی اصطلاح انگزائٹی کے پیچھے لذتیت پسندانہ یعنی Hedonistic تحریک موجود ہے جبکہ سوداویہ ایک خالص ذہنی اُفتاد یعنیMental Exhaust ہے جس کے پیچھے علمی و تحقیقی تحریک موجود ہے۔ جیسے عربی زبان میں "ھذا" اور "ذلک" دونوں اسمائے اِشارہ ہیں لیکن قدیم متون میں ھذا کی جگہ جب ذلک لکھا ہوا ملتا ہے تو فوراً دماغ چکرا جاتا ہے کہ آخر مصنف نے ایسا کیوں کیا جب کہ یہاں ضرورت ھذا کی تھی۔

پس جب زبان فوت ہو جائے، اہلِ زبان ناپید ہو جائیں اور مخاطبین نہ رہیں تو متن اپنی اصلی صورت میں یتیم ہو جاتا ہے۔ تب متن کا کوئی ولی وارث نہیں رہتا اور پھر جس کا جیسے دل کرے متن پر اپنے ادراک کا قبضہ جما لے۔ ادراک کی اِسی قبضہ گیری کو عربی میں تفہیم کہتے ہیں یعنی "متن کو جیسے مَیں نے سمجھا"۔

متن کو جیسے مَیں نے سمجھا ہی دراصل تعبیرات کا وہ گورکھ دھندہ ہے جو متن کو امیر خسرو کی پہیلی بنا دیتا ہے یعنی یہ نہیں معلوم کہ پہیلی سچ میں بُوجھی یا نہیں بُوجھی لیکن جو وضاحت میرے پیشِ نظر تھی، "بس وہ کر دی"۔

متن کی اِس سنگین یتامت و احتیاج کا ابھی تک کوئی حل دریافت نہ ہو سکا۔ بے سہارا متن جس کی نہ تو زبان زندہ رہی نہ مخاطب چنانچہ ایسی بے بسی کے عالم میں اپنے

آپ کو ایک اجنبی قاری کے فہم کے سپرد نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا؟۔ اِس صورت میں اب یہ قاری کے اپنے فہم پر منحصر ہے کہ وہ متن کے ساتھ کیا سلوک اختیار کرتا ہے۔ متن کے ساتھ قاری کے اِس سلوک کو اسلامی اصطلاح میں "اجتہاد" اور اُردو اَدب میں "تشریح" کہا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کا متن بعد میں مرتا ہے پہلے اُس کا مصنف مرتا ہے پھر اُس کے مخاطب مرتے ہیں اور آخر میں اُس کی زبان مر جاتی ہے۔ یوں متن باقی تو رہتا ہے لیکن اِس سنگین یتیمی کے بعد اپنے نئے مخاطب اور قاری کے فہم کے ہاں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قید ہو جاتا ہے۔ چنانچہ متن کی یہ قید ہی ہے جو ایک متن کو زندہ رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر متن نئے قاری نہ پیدا کر سکے تو زمانے کی گرد میں خاموشی سے تحلیل ہو جاتا ہے۔ اپنے وقت کے کئی اعلیٰ ترین متون آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں لیکن جتنے قدیم متون موجود ہیں وہ اِس لئے موجود ہیں کہ اُن کے نئے مخاطب پیدا ہو رہے ہیں۔ یعنی جس وقت کسی متن کی زبان اور مخاطب ناپید ہو جاتے ہیں تو تب صرف نیا قاری ہی اُس مُردہ متن کو زندہ رکھ پاتا ہے اور اگر متن کو نیا قاری نہ ملے تو وہ متن ایک ناوجود کی حیثیت سے کتب خانوں میں کہیں دَب کر رہ جاتا ہے۔ دنیا میں کئی ایسے متون کتب خانوں میں موجود ہیں جنھوں نے اپنے وقت میں وقت کو ہِلا کے رکھ دیا تھا لیکن آج اُن کی خبر خود علماء و محقّقین کو بھی نہیں رہی۔

گوتم بدھ کی تعلیمات پر مبنی متن "دَھم پَد" جس کے پورے مجموعے کو انگریزی میں Pali Canon کہا جاتا ہے دراصل آج سے دو ہزار سال پہلے پورے برصغیر اور آس پاس کے خطّوں میں انسانی دماغ کو سوچنے کا بالکل نیا زاویہ سکھا گیا اور اِس سے برصغیر کی انتہائی معروف اور اعلیٰ ترین تہذیب گندھارا نے جنم لیا لیکن آج حال یہ ہے کہ خود محقّق بھی اِس متن کے بارے میں نہیں جانتے۔

قریبی زمانے یعنی تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کا معروف Cathar Text جس نے جنوبی فرانس میں ایک کہرام مچا دیا تھا آج کتب خانوں میں موجود تو ہے لیکن اِس کے متعلق کوئی عام معلومات موجود نہیں ہیں اور نہ ہی یہ متن آج اپنے قاری پیدا کر رہا ہے۔ اِس طرح کئی اعلیٰ ترین متون جو اپنے اپنے وقت میں عوام اور خوّاص کے اَذہان پر حکمرانی کر رہے تھے آج صرف کتب خانوں کی الماریوں میں گرد سے اَٹے پڑے ہیں کیونکہ یہ متون اپنے نئے قاری پیدا کرنے سے معذور ہو گئے۔ متن کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو ورنہ اِس کی قسمت چار دہائیوں کے بعد پھوٹ جاتی ہے۔

تعبیر متن کو صرف اُس صورت میں زندہ رکھ سکتی ہے جب متن اپنے اندر نئے مخاطب پیدا کرنے کی صلاحیت (Potential) رکھتا ہو ورنہ بات وہی ہے۔

تعبیرات کے مسائل کا حل ممکن نہیں لیکن نئے مخاطب پیدا کرنے کے بعد متن کسی نہ کسی طرح سے اپنے آپ کو مخاطب کے شعور کے ساتھ موافق کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور یہی کوشش متن کو ہر دَور میں زندہ رکھتی ہے۔

تعبیر کا مسئلہ اِس لئے حل نہیں ہو سکتا کہ مصنف اپنے وقت کی زبان اور اہلِ زبان کے اُصولوں کا پابند ہوتا ہے اور وہ اُسی زبان سے متن تشکیل دیتا ہے جو اُس کے آس پاس بولی جا رہی ہوتی ہے اور ایسی زبان میں لفظ، اصطلاح، روزمرہ، محاورہ، تشبیہ اور استعارہ مفہوم (Understood) ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسا نہیں ہوتا کہ مصنف متن تشکیل دیتے وقت اپنی کوئی الگ سی زبان ایجاد کر رہا ہوتا ہے، نہیں بلکہ وہ اپنے ماحول کی زبان کو اپنے مدعا کے اظہار کا ذریعہ بنا رہا ہوتا ہے۔ متن اور زبان کا یہ خاص تعلق نہ سمجھنے کے سبب ہی تعبیرات کے فسادات پیدا ہوتے ہیں۔

تعبیرات کے فسادات سے مراد وہی تعبیرات کا گورکھ دھندہ ہے جو متن کو فرداً فرداً ہر نئے مخاطب سے اُس کے فہم کے مطابق متوازن (Adjust) کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر نئے مخاطب سے متن کا یہ توازن (Adjustment) دراصل متن کا ذاتی کمال نہیں ہوتا بلکہ اِس کے مخاطب کے اپنے شعور کی جولانیاں (Intellectual Vivacities) ہوتی ہیں جو متن کے اندر یہ اہلیت پیدا کر دیتی

ہیں البتہ کچھ متون اپنے اندر یہ فطری صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ ہر نئے مخاطب کے تازہ شعوری بہاؤ(Fresh Intellectual Flow)کو اپنے جذب کر سکیں۔

تعبیرات کا یہ گورکھ دھندہ صرف زبان تک محدود نہیں بلکہ ہماری پوری تاریخی علمیات(Historical Epistemology)کا مسئلہ رہا ہے اور تاریخ میں جتنے بھی متن انسانی ذہن کو متاثر کرتے رہے ہیں، ساتھ ہی تعبیر کے مسائل سے بھی دوچار رہے ہیں اور یہ صورتحال آج بھی جاری وساری ہے۔

☆☆☆☆☆



سید المجاذیب خواجہ نعمان نیرؔ کلاچوی صوبہ خیبر پختونخواہ کی ایک دور اُفتادہ تحصیل کلاچی کے باسی ہیں۔ آپ ایک جامع العلوم شخصیت ہیں۔ آپ بیک وقت مذاہبِ عالم، علم الکلام و فلسفہ، شعر و اَدب، صحافت و بلاغت، معاشرت و سیاست، نفسیات و روحانیات اور رقص و موسیقی پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے سے مسلسل گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں اور دریں اثناء علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ماڈرن فلاسفی اور علمِ نفسیات پر آپ کا علمی کام اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انٹرنیٹ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ چھ کتابوں "عشق کی سائنس"، "تصوف کی ڈکشنری"، "صراطِ دانش"، "سوزِ نہاں"، "قبیلہ نور احمد خیل" اور " Trek to Intellect " کے مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر کئی مقالات و علمی شذرات کے بھی مؤلف و مصنف ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ بھی آپ ہی کی علمی و تحقیقی جہد کا ماحصل ہے۔